مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت گنگوہیؒ کے ایک گمنام شاگرد اور خلیفۂ مجاز

حضرت مولانا صدیق احمد کاندھلوی

امام العصر ریحانۃ الہند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے فیضان علم و معرفت سے معمور طویل کاروان فضل و کمال سے قصبہ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر۔ یوپی) کے درج ذیل افراد بھی وابستہ و منسلک ہیں، ان کو حضرت سے شرف تلمذ یا اجازت و خلافت یا دونوں حاصل ہیں۔

۱۔ حضرت حافظ مرزا الٰہی بخش تیموری گورگانی دہلوی ثم کاندھلوی[۱] متوفی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء اجازت و خلافت

۲۔ حضرت حافظ اللہ دیہ بیگ خلف فضل بیگ کاندھلوی[۲] متوفی بعد ۱۳۰۶ھ/.... اجازت

۳۔ نمبردار نصیر الحق بن عبد الحق خلف مولانا ابو القاسم بن مفتی الٰہی بخش[۳] متوفی قبل از ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء

اجازت و خلافت

۴۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ خلف مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلوی[۴] متوفی ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء تلمذ

---

[۱] و [۲] ان دونوں بزرگوں کو حضرت سے اجازت و خلافت کی کوئی مستند تحریری اطلاع راقم سطور کے علم میں نہیں ہے مگر مختلف روایات سے ان کے حضرت سے مجاز بیعت ہونے کی تائید ہوتی ہے نیز حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت محدث گنگوہی کے مکتوبات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں معرفت و سلوک میں کامل، اور دونوں بزرگوں کے معتمد اور قریب تھے۔ حافظ اللہ دیہ بیگ کے نام حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے مکتوبات راقم سطور نے ترجمہ اور حواشی کے ساتھ تبرکات کے نام سے شائع کر دیئے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش کا کسی قدر تعارف آئندہ صفحات میں آ رہا ہے۔

[۳] تذکرۃ الرشید۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۱۶۰ حصہ دوم۔ طبع اول (میرٹھ: ۱۳۲۶ھ) [۴] تذکرۃ الرشید ص ۱۹۸ ج ۱ طبع اول (میرٹھ ۱۳۲۶ھ) تذکرۃ الخلیل مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۲۰۲، ۲۰۳ (سہارنپور: ۱۳۹۵ھ) نیز دیکھئے آپ بیتی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

۵۔ حضرت مولانا محمد میاں خلف مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلوی [۱] متوفی ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء تلمذ

۶۔ حضرت مولانا صدیق احمد خلف حکیم عبدالرحیم کاندھلوی [۲] متوفی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۱ء تلمذ و اجازت

۷۔ حضرت مولانا رضی الحسن خلف مولانا حکیم محمد ابراہیم کاندھلوی [۳] متوفی ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء تلمذ

۸۔ حضرت مولانا محمد الیاس بن مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلوی [۴] متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء بیعت و استفادہ و تلمذ

مذکورہ بالا فہرست تین قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔ بعض فرط شہرت سے محتاج تعارف نہیں بعض کا صرف نام و نسب معلوم ہے مفصل حالات دریافت نہیں اور بعض کا تذکرۃ الرشید وغیرہ مختلف مطبوعہ ماخذ میں مجمل و ناتمام ذکر ملتا ہے اور ان کے متعلق غیر مطبوعہ روایات و اطلاعات بھی مفقود نہیں ہیں وران کی بعض تالیفات و تحریرات بھی دریافت ہیں ایسے ہی نیم متعارف افراد میں حضرت مولانا صدیق احمد بھی شامل ہیں جو حضرت کے شاگرد اور خلیفہ مجاز ہیں، آئندہ سطور مولانا کے احوال و تعارف پر مشتمل ہیں

خاندانی پس منظر

مولانا صدیق احمد کاندھلہ ضلع مظفر نگر (انڈیا) کے ایک قدیمی صدیقی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں جو آٹھویں صدی ہجری سے کاندھلہ میں مقیم ہے، اور اپنی معلوم تاریخ کے ہر دور میں علم و کمال کے نئے نئے گل بوٹے کھلاتا رہا ہے، سلسلۂ نسب جو بیس واسطوں سے قاضی ضیاء الدین سنامی تک پہنچتا ہے اس طرح ہے :۔

"مولانا صدیق احمد بن حکیم عبدالرحیم بن حکیم رحیم اللہ بن حکیم عزیز اللہ بن حکیم حفیظ اللہ بن محمد دائم ابن محمد دائم بن حبیب اللہ بن عتیق اللہ بن محمد حافظ بن عبداللہ بن قاضی چالا

---

[۱] تذکرۃ الخلیل صفحہ ۳۰۲ آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صفحہ ۱۹۰ ج ۲ (سہارنپور : بلاسند)

[۲] تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۹۰ ج ۲ = [۳] تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۹۰ ج ۱ =

[۴] حضرت مولانا محمد الیاس کو (میری معلومات کے مطابق) حضرت سے رسمی تلمذ، در اجازت بیعت حاصل نہیں، مگر مولانا حضرت سے بیعت ہیں۔ اور تقریباً دس سال تک ہمہ وقت شبانہ روز حضرت کی خدمت میں حاضر اور صحبت سے مستفید رہے۔ اس وسیع صحبت و استفادہ کی وجہ سے جو بہت کم تلامذہ اور خلفاء کو میسر آیا ہوگا، مولانا کو حضرت کے شاگردوں میں شمار کرنا شاید غلط نہ ہوگا۔؟

(کذا) بن نصیر اللہ ابن حاجی اسمٰعیل بن عتیق اللہ بن قاضی بڈھ بن قاضی محمد بن قاضی کریم الدین بن امام مذکر ابن امام تاج بن امام حاج بن قاضی ضیاء الدین سنامی"۔[1]

حکیم رحیم اللہ اچھے عالم، جید طبیب اور نہایت ذہین و ذکی شخص تھے، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے تعلیم حاصل کی[2] حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے[3] اور حضرت حافظ محمد ضامن تھانوی سے فیض روحانی اخذ کیا[4]، مختلف ملازمتوں پر فائز رہے، اور بڑی نیک نامی کے ساتھ زندگی گزاری، آخر عمر میں وطن آگئے تھے اور مطب کے ذریعہ اہل وطن کی خدمت کرتے رہے اور طویل عمر پاکر کاندھلہ میں وفات ہوئی۔

حکیم رحیم اللہ کے بعض اخلاف کی زبانی روایات سے موصوف کی طب کے موضوع پر تالیفات کی

---

[1] مفصل نسب نامہ خاندان مرتبہ و محررہ حاجی محمد محسن کاندھلوی۔ ورجسٹر حافظ مسعود احمد نبیرہ حکیم رحیم اللہ۔

[2] روایت مولوی محمد عثمان خلف مولانا صدیق احمد وغیرہ اخلاف حکیم رحیم اللہ۔

[3] "تذکرہ حافظ محمد ضامن تھانوی شہید، مع مونس مہجوراں مؤلفہ مولانا ضیاء الدین رامپوری۔ مرتبہ جناب امداد صابری صـ ۱۱۲ (دہلی ۱۹۸۲ء)

بیعت غالباً اس وقت ہوئے ہوں گے جب حضرت سید احمد شہید اپنے دورہ گنگ وجمن کے موقع پر ۷ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ کو کاندھلہ تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس دورہ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے: سیرت سید احمد شہید از حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صـ ۱۷۰ صـ ۱۸۱ ج ۱ لکھنؤ: ۱۳۹۰ھ نیز دیکھئے مہمات احمدیہ حضرت مفتی الٰہی بخش صـ ۳ (آگرہ ۱۲۹۹ھ)

یہاں یہ اطلاع قابل ذکر ہے کہ جب حضرت سید صاحب نے تکیہ۔ رائے بریلی میں قیام کے دوران، سفر ہجرت موخر کرکے پہلے حج کرنے کے ارادہ کا اعلان کیا اس وقت سید صاحب کی خدمت میں جو متوسلین حاضر تھے ان میں ایک نام عبد الرحیم کاندھلوی کا بھی آتا ہے۔ سید احمد شہید از جناب غلام رسول مہر صـ ۱۷۹ ج ۱ لاہور: ۱۹۵۴ء) قیاس چاہتا ہے کہ صحیح نام رحیم اللہ ہو، لیکن اگر مہر صاحب کی اطلاع مطابق واقعہ ہے تو اس سے قاضی عبد الرحیم خلف قاضی غلام حیدر بن قاضی غلام حسین مراد ہوں گے جو اس وقت نوجوان تھے، اور ۱۸۵۷ء میں معرکہ شاملی و تھانہ بھون کے نامور مجاہد قاضی عنایت علی کاندھلوی ثم تھانوی کی جنگ کے دوران مدد کرنے اور تھانہ بھون سے نکل آنے کے بعد ان کو اپنے گھر میں پناہ دینے کے الزام میں مجرم قرار دیئے گئے ان پر مقدمہ چلا، جائداد ضبط ہوئی سزا ہوئی مگر بعد میں بہت کوشش و سفارش کے بعد جائداد واگذاشت اور باقیماندہ سزا معاف ہوگئی تھی۔ متعلقہ دستاویزات ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

[4] تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید صـ ۱۱۳ (دہلی: ۱۹۸۲) کتاب مذکور نیا ایڈیشن صـ ۱۴۴ صـ ۱۴۵ (لاہور: ۱۹۸۶ء)

(دارالارشاد ممبئی) [1] مگر حکیم صاحب کی کوئی تحریر محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے اس روایت کی صداقت مشتبہ ہے، لیکن حکیم صاحب کی ایک اور خوبصورت یادگار گذشتہ ایک سو چالیس سال سے اہل کاندھلہ کو درس عمل دے رہی ہے اور ہمہ وقت حکیم رحیم اللہ کی یاد تازہ کراتی رہتی ہے، یہ عمارت کاندھلہ کی جامع مسجد ہے جو حکیم صاحب کے انتظام و انصرام میں مکمل ہوئی، کاندھلہ کی کہن سال پرانی جامع مسجد جو ساڑھے چار سو سال سے اہل کاندھلہ کی رفیق تھی اور ان کے عیب وصواب اور عروج وزوال کا مشاہدہ کر رہی تھی یک لخت گر پڑی۔ اس مسجد کے متولی و منتظم قاضی محی الدین خلف قاضی نجیب الدین نے اس جگہ کے تنگ اور ناکافی ہونے کی وجہ سے وہاں سے ذرا فاصلے پر ایک نئی وسیع اور کشادہ مسجد کی تعمیر ۲ سر ۱۲۱۰ھ کیا۔ نئی مسجد کی حدود کی تعیین اور بنیادوں کی بھرائی شروع ہوئی تھی کہ برادران وطن کی جانب سے سخت مزاحمت و فساد اور قاضی محی الدین کی اچانک وفات کے سبب سے تعمیر اسی جگہ رک گئی[2] اس وقت حکیم رحیم اللہ نے اس کو پورا کرانے کا عہد کیا اور کئی سال کی سخت محاذ آرائی طویل مقدمہ بازی کے بعد اس مسجد کو مکمل کرانے میں کامیاب ہوئے، تعمیر سنہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں پایۂ اختتام کو پہنچی، مرزا امیر بیگ امیر کاندھلوی[3] نے تاریخ کہی

---

[2] اسی مسجد کے حدود کی تعیین اور مسجد سے ملحق متنازعہ قطعہ اراضی کے متعلق مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش والد ماجد حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی کو گواہی کے لئے طلب کیا تھا مولانا نے حقیقت واقعہ بیان فرمائی اور وہ جگہ ہندوؤں کو مل گئی، مولانا کی سچائی اور حق گوئی آج تک زبان زد خاص وعام ہے۔ اس واقعہ اور مولانا کی شہادت کی تفصیلات کے لئے رجوع فرمایئے، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ ص ۳۵۸-۳۶۰ (لکھنؤ: ۱۹۷۱ء)۔ اور ماہنامہ الفرقان لکھنؤ: مارچ ۱۹۸۱ء نیز الفرقان بریلی صفر ۱۳۶۲ھ ص ۲۱ یہ واقعہ الفرقان کے اول الذکر شمارہ سے نقل و ترجمہ ہو کر ہندوستان کی مختلف زبانوں کے پچاسوں اخبارات و رسائل میں شائع ہوا ہے۔

[3] مرزا امیر بیگ تاریخ اردو ادب کی ایک گمنام مگر ناقابل فراموش شخصیت ہیں، وہ شہباز بیگ کے بیٹے، سعادت یار خاں رنگین کے بھتیجے اور طہماس خاں کے پوتے تھے، مختلف علوم کے ماہر، قادر الکلام شاعر، اور اچھے تاریخ گو تھے، تمام عمر انگریزی فوج کی ملازمت میں گزاری ۱۸۱۱ء سے ۱۸۶۰ء تک فوج میں سوار، رسالدار اور جمعدار رہے، طویل عمر پائی ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کے آخر تک حیات تھے، مجموعہ کلام، نقل کردہ متعدد کتابیں اور سرکاری دفتری کاغذات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔

تعجب ہے کہ رنگین نے ان دونوں باپ بیٹوں کا اپنی تصانیف میں کوئی ذکر نہیں کیا، اور معلوم نہیں کیوں خود طہماس خاں نے بھی اپنی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے شہباز بیگ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ شہباز کا خلف طہماس ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے، خود ہمارے پاس ایسی متعدد دستاویزات محفوظ ہیں، جس پر طہماس خاں کے پہلو بہ پہلو شہباز بیگ کی مہریں اور دستخط "پسر طہماس خاں" کی صراحت کے ساتھ ثبت ہیں شہباز بیگ اور ان کے بیٹے امیر بیگ کا پہلی مرتبہ پروفیسر محمد اسلم نے طہماس نامہ کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے (لاہور جون ۱۹۸۶ء)

مسجدے از عہد تغلق شاہ بود ....

چوں محی الدین بسر نومیرا راحت زیں — سجدہ گاہ عارفاں چوں ....

در ہزار و دو صد و شصت و چہار از سال ہجر — یافت تعمیر مقدس افضل ...... ایں[1]

باز تکمیلش رحیم اللہ چو کرد از صدق دل — بت پرستاں پست گرد یدا نچناں بر خواست ایں

مبطل کفار و شرک، نسخ دید و بت کدہ — رونق اسلام و دیں افزودہ راہ راست ایں

منزل عرفاں طریق مصطفیٰ دار العطا — ثانی بیت الحرم شد بر زمیں پیدا است ایں

بہر تاریخش امیر از غیب ایں الہام یافت — مسجد اطہر بنا چوں کعبہ با اقصیٰ است ایں[2]

حکیم رحیم اللہ کے دو نکاح ہوئے، زوجہ اولیٰ سے صرف ایک دختر بو زینب یادگار تھیں جو عابدہ زاہد عارف و خدا رسیدہ خاتون تھیں، بزرگوں اور اہل خاندان میں مشہور تھا کہ بو زینب قطب وقت ہیں، زوجۂ اولیٰ کی وفات کے بعد دوسرا نکاح حضرت میاں جیو نور محمدؒ کی بھتیجی بیگم بنت غوث محمد جھنجھانوی سے ہوا ان سے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں عبد اللہ[3]، عبد الرحمٰن، عبد الرحیم، عبد الکریم، عبد العزیز عبد الحکیم، عبد الرحیم مولانا صدیق احمد کے والد ماجد تھے۔

حکیم عبد الرحیم نے اپنے والد حکیم رحیم اللہ سے فارسی اور طب پڑھی اور تعلیم کے بعد ایک انگریز افسر کے پیش کار مقرر ہوئے۔ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی جو اس زمانہ میں بہت ہی غیر معمولی خیال کی گئی اسی ملازمت کے دوران ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ اپریل ۱۸۷۹ء میں سہارنپور میں وفات ہوئی، نعش کاندھلہ لائی گئی اور آبائی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ حکیم عبد الرحیم کے دو صاحبزادے تھے: صدیق احمد اور رشید احمد۔ موخر الذکر نے طب پڑھی اور اسی مشغلہ میں زندگی گزاری کاندھلہ میں

---

[1] یہ اشعار امیر بیگ کے کاغذات میں دستیاب ہوئے، بعض الفاظ جو چوہے نے کتر دیئے تھے وہاں نقطے لگا دیئے گئے ہیں۔

[2] امیر بیگ نے اپنی تحریر میں مصرعہ تاریخ کے اعداد ۱۲۶۵ھ لکھے ہیں مگر ابتدائی شعر میں شصت و چہار کی صراحت کے بعد ۱۲۶۵ھ تاریخ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مصرعہ کے اعداد ۱۲۵۷ھ ہوتے ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ شصت و چہار کی وضاحت کے بعد کسی اور اطلاع کی ضرورت نہیں۔

[3] حافظ مسعود احمد کے شجرہ میں عبد اللہ کا نام نہیں ہے۔ یہ نام مع تفصیل حاجی محمد محسن کے شجرہ میں موجود ہے۔

وفات ہوئی۔

پیدائش، تعلیم مولانا صدیق احمد کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر مولانا فرمایا کرتے تھے کہ: "میری پیدائش غدر کے ایک سال بعد کی ہے"۔[1] اس روایت کی بنا پر تاریخ ولادت اواخر ۱۲۷۴ھ / وسط ۱۸۵۸ء متعین کی جا سکتی ہے، خاندانی روایات کے مطابق قرآن شریف حفظ کیا اور محلہ خیل میں مقیم ایک عالم سے جن کا نام معلوم نہیں[2] ابتدائی کتابیں پڑھیں، یہ استاذ اہل معرفت، عالم اور صاحب کمال تھے، مولانا ان

---

[1] یادداشت حکیم محمد عمر خلف مولانا صدیق احمد کاندھلوی۔ یہ یادداشت حکیم صاحب کی مرویات و اطلاعات کا تحریری مجموعہ ہے، جو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے قلم بند کی گئی ہیں۔ راقم سطور نے اس یادداشت سے خاصا استفادہ کیا ہے اور اس یادداشت کے علاوہ مولانا صدیق احمد صاحب کے صاحبزادگان مولوی محمد عثمان (صدیقی دواخانہ۔ نواب شاہ روڈ سکھر) مولانا محمد علی صدیقی (صدر مدرسہ شہابیہ رنگ پورہ روڈ۔ سیال کوٹ) اور جناب مولوی شبیر احمد جذبی (کاندھلہ) سے ملاقات و سوالات کے ذریعہ معلومات حاصل کئے ہیں، ہر ایک اطلاع اور روایت کا حوالہ درج کرنا طول عمل تھا۔ تاہم میں سب کا ممنون ہوں کہ ان معلومات سے نوازا، خصوصاً موخر الذکر کا کہ مولانا کی تالیفات اور یادداشت کی مذکورہ نقل ان کے ذریعہ سے دستیاب ہوئی ــــ

[2] اطلاع حکیم محمد عمر خلف مولانا صدیق احمد۔ میرا خیال ہے کہ یہ استاذ مرزا الٰہی بخش گورگانی دہلوی ہوں گے، جو دریافت معلومات کے مطابق حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت اور غالباً حضرت گنگوہی کے خلیفۂ مجاز تھے۔ مرزا الٰہی بخش، خانوادۂ تیموری کے چشم و چراغ، ذی علم پارسا اور صاحب کمال شخص تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد جب قلعۂ معلی اجڑا اور اس کے مکین خانماں برباد پھرے۔ اس وقت شاہی گھرانے کے متعدد افراد کاندھلہ کیرانہ میں اپنے اہل تعلق کے یہاں آکر مقیم ہوئے، کاندھلہ آنے والے اصحاب میں مرزا الٰہی بخش بھی شامل تھے مرزا صاحب نے اخوندجی والی مسجد محلہ خیل میں زندگی گزاری، اور اس مسجد کو جو اس وقت مختصر اور تاریک تھی خود اینٹیں تھاپ کر نئی تعمیر کرائی فارغ اوقات میں بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ میرے جد بزرگوار مولانا رؤف الحسن کاندھلوی نے قرآن شریف ان سے ہی پڑھا تھا۔ فارسی اور تصوف کی کتابوں کا درس بھی ہوتا تھا، ان سے کاندھلہ اور نواح کے لوگوں کو بہت فائدہ ہوا، مولانا صدیق احمد کے ابتدائی زمانہ کے شاگرد بھی مرزا صاحب سے استفاضۂ روحانی کرتے رہے۔ مثلاً حکیم تحمل حسین پانی پتی ملاحظہ ہو: رموز الاطبا، تالیف حکیم فیروز الدین لاہوری ج ۲ ص ۹۱ (لاہور) مرزا صاحب کا حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے علاوہ حضرت نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی وغیرہ اکابر دیوبند سے بھی بہت گہرا اور قرب و اختصاص کا تعلق تھا، مختلف بزرگوں کے متعدد خطوط میں اس کے اشارات ملتے ہیں۔ مرزا صاحب دارالعلوم دیوبند کے بھی بہت سرگرم معاون تھے دارالعلوم کے اس دور کی رودادوں میں مرزا صاحب کا بار بار ذکر آتا ہے۔ مرزا صاحب نے ۱۶ ربیع الاول ۱۳۰۷ھ / ۱۰ دسمبر ۱۸۸۹ء کو کاندھلہ میں وفات پائی، حظیرہ پہاڑ خاں کے عقب میں دفن ہوئے رحمہ اللہ ورضی عنہ

کا بے حد احترام کرتے تھے، اور ہمیشہ اپنے ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتے اور سختی سے ان کی رائے پر کاربند رہتے تھے۔ عربی کی اعلیٰ درسی کتابیں اور طب بتمام وکمال دادا صاحب حکیم رحیم اللہ سے اخذ کی، تعلیم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، ان کے افسر نے مولانا کو ان کے والد کی جگہ ملازمت کی پیش کش کی، مولانا حسب معمول استاذ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشورہ چاہا، استاذ محترم نے ملازمت قبول کرنے سے منع کیا اور ریحانۃ العصر حضرت گنگوہی سے حدیث پڑھنے کی ہدایت کی، مولانا نے ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا اور حضرت کی خدمت میں گنگوہ حاضر ہو گئے۔ حکیم محمد عمر خلف اکبر مولانا صدیق احمد کی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے والد کی وفات کے بعد فوراً گنگوہ چلے گئے تھے، مگر راقم سطور کو اس اطلاع کی صداقت میں شبہ ہے میرا خیال ہے کہ مولانا نے حکیم رحیم اللہ کی مہارت فن اور تجربات سے فائدہ اٹھایا، نسخہ نویسی کی مشق کی اور اسی دوران اواخر ۱۲۹۷ھ میں حج کے لئے گئے، اور حج سے واپسی کے بعد غالباً اواخر ۱۲۹۸ھ میں گنگوہ پہنچے، میرے خیال کی اساس مولانا ضیاء الحسن کاندھلوی متوفی ۱۳۱۵ھ کے روزنامچہ کی اس اطلاع پر ہے

" روانگی حج محمد سلیمان، وحافظ احسان الحق، وشیخ محمود بخش، ومولوی محمد صدیق ۳ شوال المکرم ۱۲۹۷ھ / ۹ دسمبر ۱۸۸۰ء"

اسی روزنامچہ میں ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۹۸ھ / ۱۴ فروری ۱۸۸۱ء کے اندراج میں مذکورہ بالا اصحاب کی حج سے واپسی کا ذکر ہے، ان اندراجات سے کئی باتوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، اول تو یہ کہ مولانا محمد صدیق اس وقت درسیات کا نصاب مکمل کر چکے تھے اور ایسے باصلاحیت تھے کہ خاندان کے بزرگ اور جید علماء ان کو مولوی کے خطاب سے یاد فرماتے تھے، اور اس سے مولانا محمد صدیق کی معاشی آسودہ حالی کا بھی علم ہوتا ہے اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس وقت تک دربار رشیدی سے وابستہ نہیں تھے، ورنہ تعلیمی سال کے اوائل میں درس حدیث ترک کر کے اتنے طویل سفر پر نہ جاتے۔

اگرچہ مولانا کے گنگوہ جانے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا سنہ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء میں گنگوہ حاضر تھے اور دورۂ حدیث پڑھ رہے تھے، اور یہ وہ پہلا سال ہے جس میں حضرت نے درس حدیث کے علاوہ تمام اسباق ترک فرما دیئے تھے، اس سے پہلے مختلف فنون کی متعدد کتابیں پڑھانے کا معمول تھا اور درس حدیث بھی جاری رہتا تھا، ۱۳۰۰ھ میں اور اس کے بعد حضرت

نے حدیث کے علاوہ کسی کتاب کا درس نہیں دیا، اس سال میں سات طلبہ کی جماعت سے دورۂ حدیث کی ابتدا ہوئی، طلبہ کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ آخر سال میں پینتیس طلبہ شریک درس تھے حضرت نے اس دورۂ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے اس جماعت میں شریک ایک شاگرد مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی کے نام تحریر فرمایا ہے:

"یہ نہیں کہتا ہوں کہ خط لکھا کرو مگر چھ ماہ یا کم زیادہ میں اگر خیریت معلوم ہو جاوے تو بہتر ہے، اگرچہ جواب کا وعدہ نہیں کرتا ہوں، باقی تمھارے ہم درس سو وہ کیوں بیٹھے رہتے، جب سے دو تین دفعہ آدمی جائے، اب شعبان کی بائیسویں کو صحاح ستہ کا چوتھا دورہ تمام ہوا، پہلے دورے میں تم تھے، غالباً (۷) حافظ احمد، حبیب الرحمٰن دیوبندی و جمیل الدین کا پہلا دورہ تھا، اور یہ چوتھا تمام ہوا۔ بسبب امراض کہ وسط سال سوم میں واقع ہوئے اور دیگر عوارض کے سبب شعبان پر ختم دورہ ہوا، ورنہ ربیع الثانی پر ہوتا تھا" [1]

مذکورہ اقتباس بتا رہا ہے کہ مولانا حافظ احمد خلف حضرت نانوتوی، مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی، اور مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سب سے پہلے مکمل دورہ درس میں شامل اور باہم رفیق و ہم درس تھے، اگرچہ اس فہرست میں مولانا صدیق احمد کا نام نہیں آیا مگر مولانا حبیب الرحمٰن کی اطلاع ہے کہ مولانا صدیق احمد بھی ان کے ساتھی اور شریک سبق تھے، مولانا کی یہ تحریر جس سے کچھ اور گمنام شرکائے درس کے نام معلوم ہوتے ہیں اور اس درس کی بعض تفصیلات بھی سامنے آرہی ہیں بہ تمام و کمال لائق مطالعہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:-

اس سال ایک رویا صالحہ دیکھنے کے بعد حضرت قدس سرہ کی توجہ صرف تعلیم علم حدیث کی طرف مبذول رہی، اور اس کی ابتدا حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب سے ہوئی۔ ابتداءً بماہ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ ترمذی شریف شروع ہوئی اس وقت

---

[1] قطب الوقت حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی کے چند غیر مطبوعہ مکتوبات بنام مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی مرتبہ: حضرت مولانا نسیم احمد فریدی مدظلہ، مکتوب ششم تصوف نمبر ماہنامہ نظام کانپور صد ۱۱۵ (۱۳۸۲ھ)

کل سات طلبہ تھے، علاوہ حضرت مہتمم صاحب کے یہ احقر، اور مولوی جمیل الدین صاحب نگینوی، مولوی ممتاز علی صاحب نگینوی، مولوی محمد یحییٰ صاحب غزنوی، مولوی کمال الدین صاحب پنجابی، مولوی حکیم محمد صدیق صاحب کاندھلوی شریک تھے، لیکن اسی سال جماعت بڑھ کر تیس پینتیس تک نوبت آگئی، اور پھر تو ساٹھ ستر طلبہ کا مجمع ہونے لگا اس وقت سے ۱۳۱۲ھ تک ہر سال دورۂ حدیث بڑی بڑی جماعتوں کا ہوتا رہا، ان بارہ تیرہ سال میں کئی سو تشنگان علوم حدیث، تمام اقطار و امصار کے سیراب ہو کر گئے، اور ممالک قریبہ و بعیدہ میں علم حدیث کے سلسلے ان کے ذریعہ سے قائم ہو گئے[1]

——— جاری

[1] فرنگیوں کا جال، امداد صابری صفحہ ۱۸۳ (دہلی: ۱۹۴۹ء) بحوالہ روداد دار العلوم دیوبند سنہ ؟

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی

دوسری قسط

حضرت گنگوہیؒ کے ایک گمنام شاگرد

اور خلیفۂ مجاز

حضرت مولانا

صدیق احمد کاندھلویؒ

سلوک و تربیت اور اجازت و خلافت

تعلیم کے بعد حضرت نے مولانا کا گنگوہ میں اپنے خاندان میں نکاح کرا دیا تھا۔ مولانا اہلیہ کو لے کر وطن واپس آگئے۔ اس خاتون سے دو بچے تولد ہوئے دونوں کمسن تھے کہ کاندھلہ میں طاعون کی وبا پھیلی جس میں دونوں بچے اور ان کی والدہ فوت ہوگئیں، اس حادثہ کے بعد مولانا نے دوبارہ گنگوہ کا قصد کیا، یہ سفر طویل قیام کے ارادہ سے اصلاح و تربیت کے لئے ہوا تھا، گنگوہ پہنچکر عالی ہمتی اور یکسوئی کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ اور سیر سلوک میں مشغول ہوگئے، اس زمانہ میں واردات و کیفیات کا نزول ہوا اور عجیب واقعات پیش آئے، ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں مولانا پر ہنسی غالب آئی اور طویل قہقہہ ہوا[1] حکیم مولانا مسعود احمد گنگوہی نے حضرت کو اس کی اطلاع دی تو حضرت نے فرمایا:۔

---

[1] اہل ارشاد و معرفت پر ہنسی کے اس طرح کے بے ساختہ ورود کو نسبت چشتیہ کے غلبہ کی علامت اور خاص اثر سے تعبیر کیا گیا ہے یہ کیفیت مختلف اوقات میں متعدد بزرگوں پر وارد ہوئی ہے، مشہور ترین واقعہ حضرت شاہ عبدالرحیم پیر و مرشد حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی کا اس وقت کا ہے جب حضرت شاہ صاحب کی حضرت سید احمد شہید سے سہارنپور میں ملاقات ہوئی تھی اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مولف انوار العارفین سے ارشاد فرمایا: باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

"مسعود احمد تیرے باپ کو پچاس سال روتے ہوئے گذر گئے ہیں۔ صدیق احمد کا ہنسی کا وہ مقام ہے جس کی مجھے بہت تمنا ہے لیکن آج تک مجھے حاصل نہ ہوسکا"۔ [۱]

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مولانا نے حضرت سے وطن جانے کیلئے ایک دو روز کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا :۔

" مولوی صدیق احمد کیا چاہتے ہو؟ مولانا نے عرض کی حضرت! دنیا کی خواہش نہیں دین کا طلبگار ہوں اور اسی کیلئے حضرت کا دامن پکڑا ہے" [۲]

حضرت اس جواب سے بے حد خوش ہوئے اور اس واقعہ کے چند دن بعد مولانا کو طلب فرما کر اجازت وخلافت سے نوازا اور وطن جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مشاغل زندگی

وطن واپسی کے بعد درس قرآن اور وعظ و اصلاح کا سلسلہ شروع کیا، اور حکیم رحیم اللہ کے مطب میں بیٹھے، آبائی ذخیرے سے استفادہ کیا۔ خاندانی مجربات اخذ کئے اور دادا صاحب کی وفات تک کاندھلہ میں مقیم رہے دادا صاحب کی وفات کے بعد حضرت کی ایما پر قصبہ بڑوت (ضلع میرٹھ) میں اقامت

پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ ـــ

چوں ہر دو ذات بابرکات بعد فراغ مراقبہ باہم می نشستند اثر ہمت قویہ ایشاں بر جناب سید احمد خندہ ہائے قہقہہ کہ خاص اثر نسبت چشتیہ است ظاہر می شد، و اثر توجہ جناب سید بر ایشاں غلبہ شکر اومی دارد"

انوار العارفین تالیف مولانا حافظ محمد حسین مرادآبادی صفحہ ۵۲۰ (نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۷۶ء)

ترجمہ :- جب دونوں بزرگان والاشان مراقبہ کے بعد باہمی ملاقات کے لئے تشریف فرما ہوئے تو اس وقت شاہ عبد الرحیم کی طاقتور نسبت کے اثر سے حضرت سید صاحب پر ہنسی اور قہقہہ کا غلبہ تھا جو خاص چشتی نسبت کی علامت ہے، اور سید صاحب کی توجہ کا شاہ صاحب پر مدہوشی و وارفتگی کی صورت میں اثر ظاہر ہوتا تھا۔

یہ واقعہ امیر شاہ خاں نے بھی نقل کیا ہے ارواح ثلثہ صفحہ ۱۶۲ (سہارنپور بلا سنہ) مگر اس کی ترتیب مذکورہ بالا روایت سے مختلف ہے

[۱] و [۲] یادداشت مولوی حکیم محمد عمر، خفیف لفظی تغیر کے ساتھ۔

اختیار کی، بڑوت میں حضرت کے متوسلین کی قابل ذکر تعداد تھی[1] متعدد افراد کو شرف بیعت حاصل تھا اور بعض کو ذکر و شغل کی اجازت بھی تھی، بڑوت میں اس اجتماع کی پیشوائی اور رہنمائی حاجی میتا کرتے تھے جو اپنی دینداری، اتباع سنت اور حضرت سے ارادت و اخلاص میں ممتاز تھے غالباً ان کی درخواست پر مولانا کو بڑوت میں قیام کی ہدایت فرمائی، اور وہاں حضرت کے سب متوسلین مولانا سے رجوع ہو گئے، مولانا کا بڑوت میں قیام قصبہ اور نواح کے مسلمانوں کے لئے گوناگوں دینی منافع و ثمرات کا اور ان کی اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنا، عوام میں فرائض و عبادات کی اہمیت کا احساس بیدار ہوا ان کی ادائیگی کی فکر ہوئی اور بقدر ضرورت مذہبی معلومات و مسائل جاننے اور یاد کرنے کا شوق ہوا۔ اور اسی کی وجہ سے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کی جانب بھی خاصی توجہ ہوئی۔

مولانا نے اپنے اوقات کی اس طرح ترتیب و تشکیل فرمائی تھی کہ اصلاح و تربیت، ذکر و شغل وعظ و ارشاد درس و افتاء، اور طب و معالجات کے مشاغل ساتھ ساتھ چلتے رہیں، نظام الاوقات تقریباً اس طرح رہتا تھا کہ علی الصباح درس قرآن ہوتا، پھر مطب کی نشست ہوتی، درس کی محفل جمتی اور دوپہر تک اسی میں مصروفیت رہتی، ظہر کے بعد فتاوی کے جوابات پر توجہ فرماتے اور حاضرین کے سوالات و مسائل حل کرتے عشاء کے بعد ذکر و شغل کا حلقہ ہوتا تھا جس میں اوسطاً بیس پچیس آدمی روزانہ شریک رہتے تھے کبھی کبھی یہ تعداد تیس پینتیس تک بھی پہنچ جاتی تھی۔

مولانا صدیق احمد کا اس وقت کے معروف اہل ارشاد و تربیت میں شمار تھا، حضرت حکیم الامت تھانوی[2] نے سلوک و معرفت کے شائقین کو جن معاصر بزرگوں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے ان میں چھٹا نام "حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کا ندھلہ ضلع مظفر نگر" کا ہے

مولانا کے حلقہ ارشاد و تربیت میں قرب و جوار کے اضلاع میرٹھ مظفر نگر وغیرہ کے علاوہ صوبہ سرحد گجرات اور پنجاب کے مختلف علاقوں کے طلبہ اور شائقین سلوک و معرفت حاضر رہتے تھے اور حسب توفیق و

---

[1] بڑوت کے متوسلین میں ایک شخص حاجی مولا بخش تھے، جو ہر ہفتہ گنگوہ حاضر ہوتے، اور مولانا محمد یحیی کاندھلوی سے فرط تعلق کی وجہ سے ان کے صاحبزادے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے لئے جو اس وقت خورد سال تھے ہر مرتبہ جوتوں کا ایک جوڑا ہدیہ کر کے آتے تھے۔ ملاحظہ ہو: آپ بیتی حضرت شیخ الحدیث ص ج ۴ (سہارنپور طباعت)

[2] تنبیہات وصیت۔ حضرت تھانوی ص۱۱ طبع اول (سادھورہ: ۱۳۳۰ھ)

وصلاحیت استفادہ وکسب کمال کرتے رہے۔

مولانا نے قصبہ کی آبادی سے الگ ایک چھوٹی سی خس پوش مسجد کو جو پھونس والی مسجد کے نام سے مشہور تھی اپنے قیام اور اصلاح و تذکیر کے لئے پسند کیا، اس مسجد میں مولانا کا ورود ونزول مسجد کے لئے روحانی ترقیات وبرکات اور تجدید وتوسیع کا پیام تھا، واردین وصادرین کی کثرت، طلبہ اور اہل سلوک کے ہمہ وقت مشاغل کے لئے مسجد ناکافی ثابت ہوئی تو مولانا نے اس کی نئی کشادہ تعمیر کا ارادہ کیا، اور اس کو ذاتی رقم سے سرانجام دینے کا قصد کیا، اس منصوبہ میں مولانا کی اہلیہ محترمہ نے تعاون وایثار کی ایک مثال قائم کی اور مولانا کے ترغیب اور توجہ دلانے پر اپنا تمام زیور مسجد کے مصارف کے لئے دیدیا۔ مگر یہ گرانقدر عطیہ بھی اس وسیع منصوبہ کے لئے کافی نہیں تھا۔ اس ضرورت کو مولانا نے اپنی ذات خاص سے پورا کیا اور چند مخلصین ومحبین کے عطیات کے علاوہ جو اُن کے اصرار وتعلق کی وجہ سے قبول فرمائے گئے۔ اکثر رقم مولانا کی مطب کی آمدنی سے صرف ہوئی۔ یہ مسجد ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء میں مکمل ہوئی، مولانا محمد حسین فقیر دہلوی نے تاریخ کہی:۔

عون حق سے حسب ارشاد رشید احمد یہاں	مسجد جامع یہاں ذیشان والا بن گئی
ہوگئی تاریخ ہجری اس کی موزوں اے فقیر	رونق اسلام مسجد خوب زیبا بن گئی ۱۳۱۵ھ

مولانا فقیر کی کہی ہوئی ایک اور تاریخ درج ذیل ہے

بنا کر پختہ وسنگین مسجد پھونس والی کو	نیا نقشہ جمایا مولوی صدیق احمد نے
دل شیطان کل کر گر پڑا تاریخ سے اسکی	خدا کا گھر بنایا مولوی صدیق احمد نے ۱۳۱۵ھ

بڑوت میں پچیس تیس سال ارشاد واصلاح کی سوغات تقسیم فرماکر وطن واپس ہوئے اور آخری دس بارہ سال کاندھلہ میں رہے، یہاں بھی تعلیم وتربیت اور سلوک ومعرفت کے مشاغل نظام الاوقات میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ جاری رہے، نماز فجر سے پہلے ذکر کا حلقہ ہوتا، فجر کے بعد تفسیر قرآن بیان کرتے اس کے بعد مطب میں بیٹھنے اور درس دینے کا معمول تھا، مولوی شبیر احمد حضرت مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہمارا گھر علی الصباح ایک خانقاہ ہوتا تھا جہاں اہل طریق اصلاح وتذکیر کے لئے آتے تھے، ذرا سورج چڑھا تو گھر مدرسہ بن جاتا تھا، طالبان علم دین جمع ہوجاتے تھے، بخاری شریف کا درس ہوتا تھا، پھر جب سورج اور بلند ہوتا تو بدنی امراض کے مریضوں سے ہمارے

گھر کا کوچہ سر بند بھر جاتا تھا، اب مطب کی کارروائی شروع ہو جاتی تھی سارا گھر مطب بن جاتا تھا۔[۱]"

مزاجی خصوصیات

اوپر گزر گیا ہے کہ مولانا نے طب میں بڑا کمال پایا تھا، آبائی قلمی ذخیرے خاندانی مجربات اور دادا صاحب کے تجربات سے خوب خوب فیض اٹھایا، اور اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت سے اس کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، مولانا کے معالجات اور دست شفا کی خاص شہرت تھی ضلع مظفر نگر میرٹھ کے علاوہ مختلف دور دراز علاقوں سے مریض آتے اور فائدہ اٹھاتے، اہل تعلق کے اصرار پر مولانا بھی اطراف وبلاد کے سفر کرتے اور مریضوں کو دیکھتے اور علاج کرتے تھے، متعدد ریاستوں لاہور، سیالکوٹ اور پنجاب کے مختلف مقامات پر بڑے معرکۃ الآرا علاج کئے اور عزت و ناموری کے ساتھ واپس لوٹے۔ اس طرح کے اسفار جو خاص اہل دولت و ثروت کو دیکھنے کے لئے ہوتے تھے۔ معقول آمدنی کا ذریعہ ہوتے۔ لیکن مولانا کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ اس طرح کی کسی رقم کو اپنی یا اہل خانہ کی ضروریات میں صرف نہیں کیا، مسجد بڑا دت کی تعمیر کے زمانہ میں ایسی تمام رقومات کا واحد مصرف مسجد کی ضروریات تھیں، بعد میں اس کا اکثر حصہ اہل حاجت غریب غربا پر صرف ہوتا، اور کچھ فیصد کبھی کبھی خاصی معقول رقم کتابوں کی خریداری کے لئے مخصوص رہتی تھی۔ طریقہ کار یہ تھا کہ سفر سے واپسی کے موقع پر اولاً سیدھے دہلی جاتے اور وہاں سے کتابیں خرید کر پھر وطن آتے تھے

ایک مرتبہ کسی رئیس کے علاج کے لئے سیال کوٹ کا سفر ہوا، وہاں کئی سو روپے کی یافت ہوئی بڑے صاحبزادہ حکیم محمد عمر ہمراہ تھے انھوں نے اپنی والدہ صاحبہ کے حسب ہدایت مولانا سے دہلی نہ جانے اور براہ راست گھر پہنچنے پر اصرار کیا۔ مولانا کاندھلہ تشریف لے آئے، اور یہاں آتے ہی وہ رقم حکیم مولانا رضی الحسن صاحب کے پاس محفوظ کرادی، اہلیہ نے حکیم محمد عمر وغیرہ کے ذریعہ ایک زمین کی خریداری کا معاملہ طے کر لیا، اور مولانا رضی الحسن سے وہ رقم منگوا کر قیمت ادا کر دی، مولانا کو اس معاملہ کا بعد میں علم ہوا تو سخت ناخوش ہوئے زمین کی خریداری پر اظہار ناپسندیدگی کیا اور اس کو دنیا کی محبت سے تعبیر فرمایا مولانا نے طب اور معالجات سے بیش قرار قمیں حاصل کیں مگر وفات کے وقت کوئی اندوختہ اور قدیم آبائی جائداد کے علاوہ کوئی

۱۔ روزنامہ حسرت، مولوی شبیر احمد جذبی خلف مولانا صدیق احمد ص۱۹۸ (کاندھلہ: ۱۹۰۵ء)

قابلِ ذکر ورثہ نہیں چھوڑا۔

مولانا اہلِ دولت و ثروت اور عام مریضوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ فرماتے تھے، روساء کے ساتھ بے نیازی اور وقار و تمکنت کی ادا تھی، ان کے مطالبات پر کم توجہ فرماتے تھے، اگر ایسے کسی مریض کو دیکھنے جاتے تو اس کے لئے کڑی شرائط اور سخت آداب و اصول تھے جن کی بجا آوری مشکل ہو جاتی تھی، لیکن غریب لوگوں کے لئے ہمہ وقت افادہ عام تھا، کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی، اگر کسی غریب و خستہ حال کی بیماری و آزار کی خبر ملتی تو بغیر بلائے خود جاتے، مریض کو دیکھتے خود دوا پہنچاتے اور حتی الامکان مالی مدد بھی کرتے تھے، کاندھلہ میں قیام کے بعد اطراف و نواح کے علاوہ طویل بیرونی سفر کا معمول نہیں رہا تھا، کبھی کبھی قصبہ میں اور کم تر دیہات میں کسی مریض کو دیکھنے جاتے تھے، جس کی اہلِ دولت و ثروت سے فیس مقرر تھی مریض کے حسب حال آٹھ آنے سے دو روپے تک، لیکن اس طرح فیس والے مریضوں کو صرف اسی وقت دیکھنے جاتے تھے، جب گھر میں خورد و نوش اور ضروریات کا سامان ختم ہو جاتا اور خرچ کے لئے کوئی پیسہ پاس نہ ہوتا تھا مولوی بشیر احمد کا قول ہے:

"وہ گھر سے باہر مریض کو اس وقت دیکھنے جاتے تھے جب گھر میں پیسہ خرچ کے لئے نہیں رہتا تھا اور والدہ مرحومہ کے تقاضے پر تقاضے آتے رہتے تھے، ان سمع خراش تقاضوں کی مجبوریوں سے وہ کتاب کو اپنی آنکھوں سے علیحدہ کرتے تھے، اور بادلِ ناخواستہ مریضوں کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکل جاتے تھے"۔[1]

مولانا کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ فصل کے موقع پر آبائی جائداد سے جو غلہ و اناج آتا تھا اس کو اسی وقت فروخت کر دیتے تھے، اور روزمرہ کی ضروریات کے لئے ہر دن نئی خریداری فرماتے گوشت آٹا اور ضرورت کا ہر سامان روزانہ بازار سے خود ہی لاتے تھے، بازار جاتے وقت قریبی اعزہ اور اہلِ محلہ سے بھی ان کی ضروریات دریافت فرما لیتے، جس کو جو چیز منگوانی ہوتی خرید کر خود ہی ان کے گھروں پر پہنچا دیتے تھے متوسلین و معتقدین خصوصاً طلبہ سے ذاتی خدمت لینے میں احتیاط فرماتے تھے۔ حالانکہ ہر موقع پر انکی ضروریات کا لحاظ رکھتے اور ان کے ساتھ مالی تعاون فرماتے رہتے تھے۔ جب پھلوں کا موسم آتا خصوصاً آم کی فصل کے موقع پر تو بازار سے وافر مقدار میں عمدہ قسم کے آم خرید کر لاتے، ان کو کاندھلہ کے مدرسہ کے طلبہ، اپنے شاگردوں اور غریب لوگوں میں تقسیم کرتے اور کراتے تھے اسکے بعد خود چکھتے اور اہلِ خانہ کو استعمال کی اجازت ہوتی تھی۔

---

[1] دردنامۂ حسرت ص ۶۸-۱۶۷ (کاندھلہ ۱۹۸۵ء)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

تیسری اور آخری قسط

حضرت گنگوہیؒ کے ایک گمنام شاگرد

اور خلیفہ مجاز

حضرت مولانا

صدیق احمد کاندھلویؒ

مولانا کو علوم متداولہ معقولات و منقولات سب پر بڑی دسترس تھی، لیکن طبعی دلچسپی اور مناسبت حدیث اور خصوصاً فقہ سے رہی، اس وقت کے ارباب فقہ و فتاویٰ میں مولانا کی خاص حیثیت اور تعارف تھا کثرت سے فتاویٰ اور علمی استفسارات آتے مگر افسوس کہ ان جوابات کی نقل و حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے وہ سب ضائع ہوئے، مولانا کی واحد مطبوعہ علمی تحریر شب برات کے موضوع و متعلقات پر حضرت تھانوی سے مفصل مراسلت ہے جو امداد الفتاویٰ میں شامل ہے[۱] اور مولانا کی حدیث و فقہ پر نظر تبحر علمی اور حسن استدلال کا نمونہ ہے۔ مولانا نے فقہ و فتاویٰ سے متعلق متعدد موضوعات پر مستقل رسائل لکھے مولانا کے فرزند مولوی شبیر احمد صاحب کی روایت ہے کہ مولانا نے بحر الرائق یا زیلعی شرح کنز الدقائق پر مفصل حاشیہ لکھا تھا مگر وہ کہاں گیا، کیا ہوا کچھ معلوم نہیں۔ اس وقت تحریری باقیات میں ایک مفصل فتویٰ جو مرض الموت کی تحقیق پر مشتمل ہے اور دو کتابیں محفوظ ہیں۔

(۱) قلائد العقیان فی دلائل فروع ابی حنیفۃ النعمان۔

---

[۱] رجوع فرمایئے امداد الفتاویٰ حکیم الامت تھانوی ص۱۸ تا ص۳۴ ج ۱ مطبوعہ کراچی: ۱۳۷۴ھ)

(۲) اثبات تحریک خلافت، وجواز ترک موالات

اول الذکر عربی میں محققانہ عالمانہ مفصل کتاب ہے۔ اور ثانی الذکر بھی فقہی عالمانہ انداز لئے ہوئے مگر اردو میں ہے اور مختصر سا رسالہ ہے دونوں کا قدرے مفصل تعارف درج ذیل ہے:

"قلائد العقیان فی دلائل فروع ابی حنیفۃ النعمان" فقہ حنفی کے حدیثی مستدلات کے موضوع پر ایک اہم تالیف ہے، جس زمانہ میں مولانا صدیق احمد تعلیم پا رہے تھے وہ زمانہ تقلید اور عدم تقلید کے مباحث سے پر شور تھا، احناف اور غیر مقلدین دونوں کی طرف سے کتابیں نکل رہی تھیں مناظرے ہو رہے تھے، جس میں دوسری مباحث وعنوانات کے علاوہ سب سے اہم اور چلا ہوا اعتراض یہ تھا کہ ائمہ فقہ کے چاروں معروف طریقوں میں سے کوئی ایک بھی حدیث وسنت کے مطابق نہیں، خصوصاً حنفیت تو سراسر رائے اور قیاس پر مبنی ہے، علمائے حنفیہ نے بار بار اس اعتراض کی کمزوری واضح کی اور معترضین کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی مگر معترضین اپنی کج بحثی اور ناوک فگنی سے باز نہیں آئے اور اس اعتراض کے تکرار سے شرمندہ نہ ہوئے تو حزب ولی اللہی کے دو نامور فرزندوں کو جس میں ایک دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور ایک حضرت گنگوہی کے شاگرد (یعنی حکیم الامت تھانوی اور مولانا صدیق احمد (اور دونوں علم وعمل میں فخر اقران اور ذہانت وذکاوت میں بے مثل تھے) اس اعتراض کو ہمیشہ کے لئے بے اثر کر دینے کا خیال آیا، اور دونوں نے غالباً بیک وقت فقہ حنفی کے ماخذ ومستدلات جمع کرنے شروع کئے، اور طویل محنت وکاوش کے بعد فقہ حنفی کی واقعی حیثیت اور اس کی حدیث وسنت سے پوری پوری مطابقت وہم آہنگی کو دلائل وبراہین کی روشنی میں آئینہ کر دیا، حضرت تھانوی نے اپنی تالیف کو احیاء السنن کے نام سے موسوم کیا، مگر اس کا مسودہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا[۱] حضرت نے اس موضوع پر پھر ایک اور کتاب جامع الآثار کے عنوان سے تالیف فرمائی اور اس پر تابع الآثار کے نام سے تعلیق لکھی یہ دونوں شائع ہو گئی ہیں مگر بہت مختصر تھیں، اس لئے حضرت نے اس موضوع پر ایک جامع اور

---

[۱] ملاحظہ ہو تنبیہات وصیت صـ۱۱ صـ۱۲ (طبع اول: ۱۳۳۰ھ) راقم سطور کو بعض شواہد وآثار سے اس کتاب کے ضائع نہ ہونے کی اطلاع اور ایک قلمی نسخہ کا سراغ ملا ہے، مگر میں اب تک اصل نسخہ کی دید ودریافت میں کامیاب نہیں ہوا۔ خدا کرے کہ مل جائے تو حضرت حکیم الامت کا ایک بڑا سرمایہ تلف ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔

مفصل تصنیف کا ارادہ کیا مگر حضرت کو اس کا موقع نہیں ملا تو حضرت نے یہ خدمت مولانا احمد حسن سنبھلی کے سپرد کی، مولانا نے احیاء السنن کے نام سے ایک کتاب لکھی اور توضیح الحسن کے نام سے اس کا حاشیہ تحریر کیا، مگر مولانا نے حضرت کی تصحیح و نظر ثانی سے گذرنے کے بعد اس میں اس قدر ترمیمات و اضافے کئے جو زبان و بیان کے لحاظ سے غلط اور حضرت کی منشار کے خلاف تھے، اس کا حضرت کو اس وقت علم ہوا جب کتاب چھپ کر آئی تو حضرت نے مولانا سنبھلی کو اس خدمت سے سبکدوش فرما کر مولانا ظفر احمد عثمانی کو اس کی اصلاح و ترمیم پر مامور کیا اور ایک نئی تالیف کا حکم فرمایا، مولانا عثمانی نے بیس سال کی محنت کے بعد اس منصوبہ کو مکمل کیا اور اعلاء السنن کے نام سے اٹھارہ جلدوں میں تالیف فرمائی جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔

قلائد العقیان حضرت مولانا صدیق احمد کے موئے قلم کی یادگار ہے، اس کی تالیف میں بھی وہی مقاصد و اصول کارفرما رہے جو احیاء السنن سے اعلاء السنن تک حضرت تھانوی کی تالیفات کی اساس تھے، مولانا صدیق احمد نے اس کتاب کو کتنے حصوں پر تقسیم کیا تھا، اور ابواب و حصص میں کیا ترتیب تھی کچھ معلوم نہیں، کیونکہ اس اہم تصنیف کا مؤلف کا نوشتہ نسخہ دستیاب نہیں، اس کتاب کی واحد دستیاب جلد جو صرف ابواب الطہارۃ پر مشتمل ہے۔ مؤلف کے نسخہ کی نقل ہے۔ مؤلف کی مکتوبہ جلد اول اور ابواب الطہارۃ کے علاوہ بقیہ حصوں کا سراغ نہیں ملا۔ تاہم ابواب الطہارۃ بھی کتاب کی افادیت و معنویت، مؤلف کے تفقہ فن حدیث سے ماہرانہ واقفیت وسعت نظر اور طریقۂ استدلال کی گیرائی و گہرائی کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں ۔

مولانا کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ ابواب فقہ کے متعلق اولاً آیات قرآنی سے استدلال فرماتے ہیں پھر ذخیرۂ حدیث سے اس کے شواہد پیش کرتے ہیں، احادیث کی فنی حیثیت صحت و ضعف پر کلام کرتے ہیں مخالف روایات پر عمل نہ کرنے کی وجہ' ان کا کمزور ہونا یا ان کا صحیح محل ذکر فرماتے ہیں، پھر اس حدیث کی مناسبت سے اقوال فقہار نقل کرتے ہیں بعض مرتبہ استدلال ایسے لطیف انداز سے ہوتا ہے کہ فقہار حنفیہ کی عبارتیں حدیث کی شرح و توضیح معلوم ہوتی ہیں، احناف کے جن مسائل و مستدلات پر دوسرے علمار نے جرح و تنقید فرمائی ہے، مولانا قُلتُ کا اشارہ دیکر اس استدلال کی معنویت ظاہر کرتے ہیں اور ایسی سادہ اور صاف وضاحت کرتے ہیں کہ اس کا حدیث نبوی سے ربط و استدلال واضح، اور مسئلہ زیر بحث بالکل بے غبار ہو جائے' زیر نظر جلد کے تمام عنوانات میں

یہی طرز فکر کارفرما نظر آتا ہے۔

قلائد العقیان کی وسعت وجامعیت کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے یہ اطلاع مفید ہوگی کہ ابواب الطہارۃ کے تحت چوّن۵۴ ابواب زیر بحث آئے ہیں اور یہ تعداد صرف اہم اور بنیادی ابواب کی ہے، بعض ابواب کے تحت جو ذیلی عنوانات ہیں وہ اس تعداد میں شامل نہیں مثلاً سنن ومستحبات ومکروہات وضو کے ضمن میں ۸۰ ذیلی عنوانات ہیں اور ان میں سے ہر ایک سنت ومستحب کے اثبات کیلئے وہی طریقہ بحث واستدلال ہے جو اہم اور وسیع ابواب کا ہے۔

مولانا صدیق احمد نے قلائد العقیان کو کل کتنی جلدوں پر مرتب ومنقسم کیا تھا، اور اس میں کتنی جلدیں مکمل ہوئیں، یا پورا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا راقم سطور کو صحیح سراغ نہیں لا، تاہم زیر نظر جلد سے جو ابواب الطہارۃ پر مشتمل ہے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے اول یہ کہ ہدست جلد، جلد دوم یا سوم ہے، کیونکہ اس کے شروع میں نہ کلمات حمد ونعت ہیں، نہ تمہید مؤلف ہے نہ وجہ تصنیف کا ذکر ہے اور نہ اس تصنیف کی ترتیب وتفہیم پر کوئی کلام ہے، اگر یہ پہلی جلد ہوتی تو اس میں خطبہ افتتاح اور کلمات مؤلف ضرور ہوتے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ کتاب اسی نہج پر مکمل ہوئی ہوگی یا ہوتی تو شاید آٹھ دس جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ افسوس کہ سردست ان معلومات کی کوئی صورت نہیں۔

زیر نظر نسخہ مولانا کے فرزند سوم مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی نے ۱۳۵۲ھ میں نقل کیا تھا ترقیمہ کتاب درج ذیل ہے۔

"فقد تمت ابواب الطہارۃ بحمد اللہ العلی الاعلی الوھاب من جملۃ الاحادیث علی بعض الفروع من مذہب ابی حنیفۃ النعمان افادھا النحریر الالمعی اللوذعی مولائی ووالدی صدیق احمد عفی عنہ الصمد۔ وکان الاختتام یوم الثلثاء ثلثین من شعبان المعظم سنۃ ۱۳۵۲ھ فی بلدۃ سیال کوٹ غفر الاحقر محمد علی الکاندھلوی کان اللہ لہ ولوالدیہ"

یہ نسخہ فلسکیپ سائز کے ایک سو تریسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، تحریر رواں اور صاف ہے، مگر اغلاط سے پاک نہیں، ابواب وعنوانات اور اہم مباحث واشارات کو سرخ روشنائی سے ممتاز کیا گیا ہے۔

رسالہ اثبات تحریک خلافت وجواز ترک موالات

مولانا صدیق احمد کی حیات کا آخری دور ہندوستان

میں سیاسی ہیجان اور تحریک خلافت کے عروج اور جوش وخروش کا زمانہ تھا، اور پورے ملک خصوصًا مسلمانوں کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے، لیکن تحریک کی شرعی اور سیاسی ضرورت وافادیت کے متعلق علمائے کرام مختلف الرائے تھے، ایک جماعت تحریک خلافت کی ہمنوا تھی، دوسری جماعت جس کے پیشوا حضرت حکیم الامت تھانوی تھے اس کی ضرورت کے معترف، مگر طریقۂ کار کو نہایت غلط اور مسلمانوں کے لئے سیاسی مذہبی ہر لحاظ سے نقصان دہ اور تباہ کن سمجھتی تھی، مولانا صدیق احمد اول الذکر طبقہ کے ساتھ تھے مولانا نے نہ صرف اس کی تحریری تائید کی، اور اس سلسلہ میں متعدد فتاوی اور تحریرات لکھیں بلکہ اس میں ذاتی طور پر شریک ہوئے۔ اور ضلع مظفر نگر کے قصبات ونواح میں خلافت تحریک کی تحریک وتنظیم قائم کرنے کے لئے خاص کوشش فرمائی، مولانا کاندھلہ خلافت کمیٹی کے صدر اور پورے علاقہ کے علماء سرپرست تھے، اسی سلسلۂ تحریک وتعاون کی ایک یادگار زیر تعارف رسالہ ہے۔

یہ رسالہ کوئی مستقل تالیف نہیں، بلکہ تحریک خلافت کے خلاف کسی عالم (غالبًا حضرت تھانوی) کی نامعلوم الاسم تحریر کا جواب ہے، اور اپنے سنجیدہ ومتین عالمانہ انداز بیان، دلائل وماخذ کے وزن اور ثقاہت میں مؤلف اور مجیب عنہٗ کے شایان شان، اور اختلاف رائے میں توازن واعتدال کی ایک مثال ہے۔ یہ رسالہ اردو میں ہے اور سولہ صفحات پر مشتمل ہے، زیر نظر رسالہ پر مؤلف کے دستخط نہیں، اور رسالہ کا عنوان اور نام بھی درج نہیں ہے۔ مگر مولانا کے صاحبزادگان کا قول ہے کہ یہ مولانا کی تحریر وتالیف ہے۔ مذکورہ بالا نام اثبات تحریک خلافت الخ راقم سطور نے رکھدیا ہے۔

درج بالا کتابوں کے علاوہ بھی مولانا کی متعدد تالیفات تھیں حکیم محمد عمر مرحوم کی یادداشت میں تحریر ہے:-

"ایک کتاب ترک موالات کے نام پر انگریزوں کے خلاف لکھی، اور علاوہ ازیں بہت سے کتابچے اور دیگر چھوٹی چھوٹی تصنیفات ہیں ——— اور یہ تمام مسودے ہمارے بھائی عثمان کے پاس محفوظ ہیں"

لیکن مولانا عثمان کے پاس تحریک خلافت مذکورہ بالا رسالہ کے علاوہ جس کا تعارف گزر گیا ہے، مولانا صدیق احمد کی کوئی اور تالیف محفوظ نہیں، اور حکیم محمد عمر کی تحریر میں اگر ترک موالات

سے یہی متعارف بالا ہے تو یہ اطلاع صحیح نہیں اکیں تحریک خلافت پر زیادہ بحث ہے اور ترک موالات پر بہت کم۔ اگر حکیم صاحب کی مراد اس کے علاوہ کسی اور رسالہ سے تھی تو وہ ضائع ہو چکا ہے۔

مولانا کی تالیفات کا ذکر کرتے وقت، مولانا کے عظیم الشان کتب خانہ کی بے ساختہ یاد آتی ہے اگر اس کتب خانہ کے حفاظت وبقا پر ذرا بھی توجہ کی گئی ہوتی تو آج ہمیں مولانا کی تصنیفات کے ضیاع کا ماتم نہ کرنا ہوتا، مولانا کی تصنیفات سے قطع نظر بھی یہ کتب خانہ حدیث فقہ اور تفسیر اور ان سے متعلق علوم کی قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا ایک خزانہ تھا، مولانا نے اس کی جمع وترتیب اور کتابوں کی خریداری میں بڑا وقت اور دولت خرچ فرمائی تھی' اور مطبوعات کے علاوہ مخطوطات سے بھی مالا مال تھا، اور ہمارے خاندانی کتب خانہ کی تقسیم کے بعد اس میں تاریخ اور ادب کے بیش قیمت ذخیرہ کا جس کا بیشتر حصہ مخطوطات پر مشتمل تھا اضافہ ہوا، بعد میں مولوی شبیر احمد صاحب نے اس کا اکثر حصہ خصوصاً نوادر ومخطوطات کتب خانہ مدرسہ نصرۃ الاسلام کاندھلہ کو عطا کر دیئے تھے، مگر افسوس کہ وہاں ان کی سخت ناقدری ہوئی، اور رفتہ رفتہ مخطوطات کا وہ وسیع ذخیرہ جو کئی سو اہم اور نادر کتابوں پر مشتمل تھا قطعاً نیست ونابود ہوگیا۔ مجھے اس نادر ورثہ کے ضائع ہونے کا بے حد افسوس ہے، جس میں سے ایک کتاب کی یاد کبھی فراموش نہیں ہوتی۔ یہ حضرت مفتی الٰہی بخش کے اردو کلام کا ضخیم مجموعہ تھا، جو تمام وکمال مفتی صاحب کے قلم سے تھا اور اس کی ایک اور خصوصیت جس نے اس کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اور بعد میں اسی قدر رنج والم کا سبب ہے، یہ ہے کہ اس کے ابتدائی صفحات مسند الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے دست مبارک کی یادگار تھے' ان صفحات میں حضرت شاہ صاحب نے اس دیوان پر نظم ونثر میں مفصل تقریظ قلم بند فرمائی تھی۔ اس کے علاوہ اس ذخیرہ میں فتاویٰ تاتارخانیہ کی بعض قلمی جلدیں، بعض کتب فقہ کے نہایت قدیم نسخے اور ہر علم وفن کی ان مول کتابیں تھیں، لیکن افسوس کہ آج اس کتب خانہ کا ایک ورق بھی محفوظ نہیں، خاندان کے علمی ذخیروں کی بربادی، مخطوطات اور نوادرات وتبرکات کا ضیاع ہمیشہ کے لئے دل کا زخم اور جگر کا ناسور بن گیا ہے جس کا کسی طرح علاج واندمال ممکن نہیں، ہمیشہ سے تر وتازہ ہے اور ہمیشہ تر وتازہ رہے گا۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مولانا کی علمی باقیات میں تصانیف اور کتب خانہ کے علاوہ تلامذہ کی بھی کثیر تعداد تھی، مولانا

نے تقریباً چالیس سال مختلف علوم وفنون کا درس دیا، دینیات کی ابتدائی کتابوں سے صحاح ستہ تک اور طب کے آغاز سے انتہا تک تمام کتابیں وقتاً فوقتاً زیر درس رہیں، مولانا سے سیکڑوں طلبہ نے استفادہ کیا ہوگا، مگر راقم سطور کو صرف چند تلامذہ کا علم ہے ان کے نام تحریر ہیں :- مولانا حکیم رضی الحسن کاندھلوی۔ مولانا متولی عقیل احمد کاندھلوی۔ مولوی محمد عمر کاندھلوی۔ حکیم مولوی محبوب الٰہی کیرانوی۔ مولوی حکیم تجمل حسین پانی پتی۔ مولانا مفتی ممتاز احمد ٹانڈوی۔ حافظ رحیم بخش عرف حافظ منگتو کاندھلوی۔ حافظ مولوی محمد ابراہیم سماہی۔ مولوی عبدالرحیم بڑوت۔

چار فرزند مولوی حکیم محمد عمر۔ مولوی حکیم محمد عثمان۔ مولانا محمد علی صدیقی اور مولوی شبیر احمد جذبی مولانا کی جسمانی یادگار ہیں۔

مولوی حکیم محمد عمر کی ۱۹۰۱ء میں ولادت ہوئی، والد بزرگوار اور اہل خاندان سے تعلیم حاصل کی والد کی وفات کے بعد مولانا رضی الحسن کاندھلوی سے بخاری شریف پڑھی اور طب کی اعلیٰ کتابوں کا درس لیا۔ والد صاحب کے سامنے ہی طبابت ومعالجات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو تاحیات جاری رہا ۱۹۴۷ء کے بعد سیالکوٹ پاکستان میں مقیم ہوئے۔ اہل پاکستان میں حکیم محمد عمر پہلے شخص ہیں جن کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سے اجازت وخلافت حاصل ہے، حالانکہ حکیم صاحب حضرت موصوف سے بیعت بھی نہیں تھے سیالکوٹ میں وفات ہوئی۔

مولانا محمد علی کاندھلوی حضرت مولانا صدیق احمد کے فرزند سوم اور معروف علمی شخصیت ہیں۔ تقریباً ۱۹۱۰ء میں ولادت ہوئی، کاندھلہ، دہلی، مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی دارالعلوم کے زمانہ قیام میں سیاسیات سے شغف ہوا جس کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ترک ہوا اور تمام اوقات سیاسی مصروفیات میں بسر ہونے لگے، بعد میں والد ماجد کے متوسلین کے اصرار پر سیالکوٹ آئے اور یہیں کے ہوگئے، سیالکوٹ میں انجمن شہابیہ کے سربراہ اور اس کے تعلیمی اصلاحی اداروں کے نگراں مقرر ہوئے، اور آج تک ہمہ وقت تعلیم وتدریس، اصلاح وتذکیر اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہیں، متعدد تصنیفات شائع ہوچکی ہیں جس میں امام اعظم اور علم الحدیث، اور تفسیر معالم القرآن مشہور ومقبول ہیں، اور اپنے اپنے موضوعات پر کثرت معلومات جمع واستقصا میں کم از کم اردو ذخیرہ میں بے مثال ہیں، "امام اعظم اور علم الحدیث" آٹھ سو صفحے کی ضخیم کتاب ہے جس کے دو

ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور "تفسیر معالم القرآن" ایک پارہ ایک جلد کی ترتیب پر مرتب ہے، اس وقت تک ۹ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تیس جلدوں کا منصوبہ ہے، اگر خدا کرے حسب پروگرام مرتب ہو جائے تو شاید قرآن شریف کی سب سے ضخیم مطبوعہ تفسیر ہو گی۔

مولوی شبیر احمد جذبی: دار العلوم دیوبند اور ڈابھیل میں عربی دینیات اخذ کیں تقریباً پچیس سال تک مقامی سیاست میں سرگرم رہے، ادھر کئی سال سے سیاسی مشغولیات ترک کر کے ملازمت اور تحریر و سخن میں مصروف زندگی گذار رہے ہیں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت مولانا صدیق احمد نے ۴ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ / ۲۳ دسمبر ۱۹۲۲ء کو کاندھلہ میں وفات پائی عیدگاہ کاندھلہ سے ملحق خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

خون دل نالید در درد فراق — چوں رواں شد سوئے فردوس بریں

سیزدہ صد سال ہجری چہل و یک — شب چہارم از جمادی اولیں

روز شنبہ بود وقت نیم شب — ارجعی فرمود رب العالمیں

دعوت محمود را لبیک گفت

شادمان خرم و خندہ جبیں

۱۳۴۱ھ

۱۹۲۲ء

استدراک

الفرقان کے گذشتہ شمارہ میں معارف الحدیث کی جو قسط شائع ہوئی تھی اس میں آخری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تھی جو صحیح مسلم سے نقل کی گئی تھی، بعد میں وہ حدیث صحیح بخاری میں بھی مطالعہ میں آئی، اس میں کچھ اضافے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو واقعہ اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ مرض وفات کے پہلے ہی دن کا ہے۔ اس حدیث کی تشریح میں اس عاجز نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ "یابی اللہ والمومنون الا ابابکر" الہام کے الفاظ تھے۔ حدیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے، یہ راقم سطور کا خیال تھا لیکن اب گمان یہ ہے کہ یہ خداوندی الہام نہیں تھا بلکہ خود حضور کا وجدان تھا۔ واللہ اعلم۔